ڈاکٹر سفیر اختر
مدیر "نقطۂ نظر"، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد

اُردو کتابوں کے فارسی تراجم

Dr. Safir Akhtar

Editor " Nuqta-e-Nazar",Institute of Policy Studies,Islamabad

Persian Translations of Urdu Texts

Persian Language was introduced in the Sub-Continent by the people who entered the region from the lands of West and Central Asia. The centuries long intercourse of these people with the local population speaking a host of languages resulted in the emergence of a hybrid language, now known as Urdu. Persian enjoyed the status of the language of court and culture for a long time, but gradually it was replaced with Urdu. Popular Persian texts were translated into Urdu as original writings in Urdu were equally increasing day by day. At the juncture of the eclipse of Persian and rising of Urdu, some Urdu texts were translated into Persian for the past oriented and conservative section of society. With the development of Urdu, quality writings started to appear in it in the late 19th century onward. It was time to translate the selected Urdu writings into Persian for the benefit of the neighboring Iranians and Afghans. The job was done, first by the writers from the Sub-Continent, but the 20th Century saw a few Afghans and Iranians busy in enriching their language though the translation of academic Urdu writings. This phenomenon is going on with a rapid pace.

برعظیم پاکستان و ہند و بنگلہ دیش اور ایران کے درمیان سیاسی اور سماجی تعلقات کا سراغ قبل از تاریخ زمانے سے ملتا ہے، اور جب بھی دو مختلف زبانیں بولنے والے گروہ باہم ملتے اور ایک عرصے تک سماجی روابط میں منسلک رہتے ہیں، اُن کی زبانیں ایک دوسرے کی زبان سے متاثر ہوتی ہیں۔ برعظیم اور ایران کی زبانوں میں یہ باہمی اثر پذیری رہی ہے، تاہم زیرِنظر تحریر میں عہدِ متوسط کے برعظیم میں فارسی کی ترویج، اردو زبان کے نشوارتقاء، آخرالذکر میں تحریر وتسوید کے تدریجی مراحل، اور وقت کے ساتھ فارسی کے چلن میں آنے والی کمی کے پس منظر میں فارسی کتابوں کے اُردو تراجم پر سرسری گفتگو کی گئی ہے، اور آخر میں اُردو کتابوں کے فارسی تراجم کی صورتِ حال پر چند گزارشات پیش کی گئی ہیں۔

عہدِ متوسط میں مغربی اور وسطی ایشیا سے آنے والے مسلمان فاتحین نے برعظیم میں جو زبانیں متعارف کرائیں، ان میں سب سے زیادہ قبولیت فارسی کو حاصل ہوئی۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں جب دہلی سلطنت وجود میں آئی تو اس کے اعلیٰ طبقات کی زبان فارسی تھی، اور جوں جوں مسلم اقتدار مضبوط ہوتا چلا گیا، مغربی اور وسطی ایشیا سے آنے والے اہلِ علم نے اس میں تصنیف وتالیف کی۔ کچھ **الناس علی دین ملوکھم** کے عمومی اثر کے تحت، اور زیادہ تر سرکار دربار سے وابستہ مفادات نے مقامی آبادی کو فارسی زبان سیکھنے پر مجبور کیا اور پھر صدیوں تک فارسی اس خطے کی ثقافتی زبان بنی رہی۔ فارسی زبان وادب نے مقامی زبانوں کو متاثر کیا، اور فارسی شناسوں نے بھی مقامی زبانوں کے الفاظ ومحاورات کو اپنی تحریروں میں بےتکلف استعمال کیا، حتیٰ کہ ایرانی اہلِ قلم کے اسلوب کے بالمقابل اسلوبِ ہندی (سبک ہندی) کی الگ شناخت قائم ہوگئی۔ یہی نہیں کہ فارسی زبان اور مقامی زبانیں ساتھ ساتھ پھلتی پھولتی رہیں، بلکہ نو واردوں کی مادری زبانوں ___ فارسی اور چغتائی وغیرہ ___ کے ساتھ اُن کی مذہبی زبان عربی بھی مقامی زبانوں پر اثر انداز ہو رہی تھی، انہی اثرات کے تحت ایک نئی زبان بتدریج وجود میں آئی جو مختلف علاقوں میں (اور مختلف اوقات میں بھی) کبھی ہندوی کہلائی، کبھی ہندی اور آخر میں اُردو کے نام سے دُنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہونے لگی۔ اُردو لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس پہلو پر خاصی تحقیق کی ہے کہ اس زبان کی تخلیق پنجاب، سندھ، شمالی ہند یا دکن میں ہوئی، تاہم زبان جوں جوں ترقی کرتی گئی، اس کا حلقۂ اثر بڑھتا گیا، اور ذخیرۂ ادب وشعر بھی۔

ابتداء میں اُردو میں شعر کہنے والے یا نثر لکھنے والے اصلاً فارسی دان تھے، اور وہ دونوں زبانوں میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے تھے، پھر وہ وقت آیا جب اُن کی ساری صلاحیتیں اُردو کی زلفیں سنوارنے میں لگ گئیں، اور اگر انہوں نے زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کچھ فارسی میں کہا یا لکھا تو وہ اردو کے مقابلے میں عامۃ الناس کی سطح پر پھیکا اور ہیٹا ثابت ہوا۔

فارسی کی ثقافتی اہمیت کے باوجود آغاز میں اس کی جگہ اُردو کو کس نے دی؟ اس سوال کے جواب میں بحیثیت مجموعی اہلِ علم کی رائے یہی ہے کہ یہ وہ افراد تھے جن کا واسطہ عوام سے تھا، اور اس طبقے میں سرفہرست صوفی بزرگ تھے، یا وہ مذہبی رہنما جو عامۃ الناس کی اصلاح وتربیت کی ذمہ داری ادا کر رہے تھے،[۱] تاہم وہ فارسی زبان وادب سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ شیخ

خوب محمد چشتی احمد آباد (گجرات) کے معروف شاعر اور صوفی بزرگ تھے۔ انہوں نے ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء میں ایک اُردو مثنوی ''خوب ترنگ'' لکھی، مگر اس کے مطالب کی وضاحت کے لیے چودہ برس بعد ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء میں فارسی میں شرح ''امواجِ خوبی''(۲) کے نام سے لکھی۔

ایک دوسرے ادیب قاضی محمود بحری (م ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء) نے دکن میں حضرت شاہ چندا صاحب کے جانشین سیّد احمد کی ترغیب پر تصوف کے مسائل پر مثنوی ''من لگن'' لکھی، مگر وہ سید احمد کے معیارِ نقد پر پوری نہ اُتری، اس پر محمود بحری نے مثنوی ''من لگن'' کے خاص خاص حصوں کو ''عروسِ عرفان'' کے نام سے ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء میں فارسی نثر میں منتقل کر دیا۔(۳)

شیخ خوب محمد چشتی اور قاضی محمود بحری نے اپنی اردو منظومات کے مطالب خود فارسی میں منتقل کیے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود تو عامۃ الناس کی زبان کو ترجیح دیتے تھے، مگر اُن کے پیر و مرشد اور سرپرست (جو غالباً اُن سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ ایک نسل پہلے کی نمائندگی کرتے تھے) تا حال فارسی کے سحر سے باہر نہ نکلے تھے۔ اس پس منظر میں شاہ معین تجلی نے پیر بادشاہ حسین کی تالیف ''وجود العارفین'' (یا ''وجود نامہ'') کو اُردو سے فارسی میں منتقل کیا تھا۔(۴)

صوفیہ کی عالمانہ اور متصوفانہ تعلیمات تو نسبتاً زیادہ باخبر اور باشعور لوگوں کے لیے تھیں، قصے کہانیاں عام لوگوں کے لیے لکھے جا رہے تھے۔ وہ قصے جو کبھی فارسی میں لکھے جاتے تھے، من وعن یا ترمیم و اضافہ کے ساتھ اُردو میں کہے جانے لگے تھے۔ اس ضمن میں بعض شاعروں نے قصے کو اپنی زبان میں بیان کرنے کی جگہ ترجمے کا راستہ اختیار کیا، مگر فارسی سے اُردو ترجمے کے ساتھ اُردو سے فارسی میں کہنے کی ایک دو مثالیں بھی ملتی ہیں۔ یہ رویہ قدامت پسند نسل کا تھا۔ جسونت رائے متخلص بہ منشی، ارکاٹ کے نواب سعادت اللہ خان کی سرکار سے وابستہ تھا، جس نے غواصی کے ''خرد نامہ'' کو ''گل کدۂ عشق'' کے نام سے فارسی میں منتقل کیا۔(۵) ''خرد نامہ'' سیف الملوک اور بدیع الجمال کی عشقیہ داستان پر مبنی ہے۔ منشی ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں پنجاب سے جنوبی ہند گیا تھا۔ اُس نے نکودر (علاقہ جالندھر) میں اپنے قیام اور اپنے عرفی نام کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے:

مرا در عرف اندرجیت نام است — مرا منشی تخلص در کلام است
وطن گاہم بود در ملکِ پنجاب — نکودر قصبۂ سرسبز و شاداب (۶)

بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی سے اُردو کی مقبولیت جوں جوں بڑھتی چلی گئی، نتیجے کے طور پر اہلِ قلم کی توجہ فارسی سے ہٹتی چلی گئی۔ فارسی قصے کہانیاں اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' (سرودہ ۱۲۵۴ھ) کا ماخذ ایک اردو نثری قصہ بتایا ہے:

فسانہ گل بکاؤلی کا — افسوں ہو بہار عاشقی کا
ہر چند سنا گیا ہے اس کو — اردو کی زبان میں سخن گو
وہ نثر ہے دادِ نظم دوں میں — اس مے کو دو آتشہ کروں میں(۷)

مگر شوق قدوائی اور سیّد ظہور حسن رام پوری نے دیا شنکر نسیم کا بیان مسترد کرتے ہوئے اُن پر الزام لگایا تھا کہ ''گلزارِنسیم'' رفعت لکھنوی کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ سیّد ظہور حسن رام پوری کے پاس رفعت لکھنوی کی مثنوی کا جو نسخہ تھا، اس سے انہیں رفعت لکھنوی کے زمانے یا مثنوی کی تاریخِ تالیف کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا، تاہم انہوں نے قیاساً یہ لکھ دیا: ''اس کے بعض مصرعوں اور شعروں کا ہو بہو ترجمہ مثنوی گلزارِنسیم میں پایا جاتا ہے۔ اس سے اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ رفعت لکھنوی فارسی کے شاعر نسیم سے پہلے گزرے ہیں''۔ (۸) رفعت کی مثنوی کی بحر اور قصہ دونوں ''گلزارِنسیم'' کی بحر اور قصے کے مطابق تھے، چنانچہ سیّد ظہور حسن رام پوری نے مذکورہ نتیجہ اخذ کرلیا۔ بعدازاں یہ بات سامنے آئی کہ محوی صدیقی (بھوپال) کے ہاں رفعت لکھنوی کی مثنوی ''گل بکاؤلی'' کا ایک نسخہ ہے جس کی ابتداء میں واجد علی شاہ اختر کی طویل مدح ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، واجد علی شاہ کے عہد سے پہلے انتقال کر چکے تھے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ پنڈت دیا شنکر نسیم نے رفعت کی مثنوی کو اردو میں منتقل کیا، بلکہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ رفعت نے ''گلزارِنسیم'' کو فارسی کا جامہ پہنایا تھا۔ (۹)

انیسویں صدی میں اس طرح اکا دُکا دوسری اردو کتابوں کو بھی فارسی میں ترجمہ کیا گیا، مگر اُردو سے فارسی ترجمے کسی عمومی رو کا حصہ نہ تھے، بلکہ انفرادی ذوق اور ضرورت ہی اس کا سبب دکھائی دیتی ہے۔ حکیم جواہر لال آگرہ کے ایک اخبار نویس تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۴ھ/۷۱-۱۲۷۰ء میں موتی لال کے اُردو رسالے ''پند نامۂ کاشتکاراں'' کا، اور ۱۸۵۵ھ/۷۲-۱۲۷۱ء میں ''تاریخِ ہند'' کا اُردو سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

مذکورہ بالا سطور میں اُردو کتابوں کے جن فارسی تراجم کا ذکر کیا گیا ہے، یہ اُردو کی بڑھتی ہوئی مثالی مقبولیت کے بالمقابل ماضی پرستی کی غمازی کرتے ہیں، تاہم انیسویں صدی میں اُبھرنے والی تحریکِ اصلاح و جہاد کے کارپردازوں نے غالباً افغان فارسی شناسوں کے لیے اپنے لٹریچر میں سے اکا دُکا کتابوں کے فارسی ترجمے کیے۔ تحریکِ اصلاح و جہاد کے ایک نمایاں فرد شاہ اسمٰعیل شہید تھے جن کی تالیف ''تقویت الایمان'' کے مضامین کی تائید و تردید میں درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں، اس کے فارسی ترجمہ و تشریح کے خطی نسخے ملتے ہیں، ان میں سے ایک ۱۲۸۱ء کا مکتوبہ ہے۔ (۱۰) خرم علی بلہوری اس تحریک کے مقبول مصنفین میں سے تھے، اُن کا رسالہ ''نصیحۃ المسلمین'' بارہا شائع ہوا ہے، اسے بھی فارسی میں منتقل کیا گیا تھا۔ (۱۱)

برصغیر کے جن مذہبی گروہوں نے زیادہ منصوبہ بندی سے اپنے لٹریچر کو فارسی میں منتقل کیا، ان میں مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار شامل ہیں۔ احمدیوں کو اپنے لٹریچر کو فارسی میں منتقل کرنے کی اُس وقت ضرورت محسوس ہوئی جب ۱۹۲۴ء میں چند احمدیوں کو ارتداد کی بنیاد پر افغانستان میں سزائے موت دی گئی تھی۔ اس موقع پر مرزا بشیر الدین محمود احمد نے افغانستان کے بادشاہ، امان اللہ خان کو مخاطب کرتے ہوئے ''دعوت الامیر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اپنے عقائد و اعمال پر گفتگو کی۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ کیا گیا۔ (قادیان: احمد بک ڈپو، ۴۴۲ صفحات) اور امان اللہ خان کو ارسال کی گئی۔ بعد میں مولوی صدر الدین نے جو کئی برس ایران میں احمدی مبلغ رہا تھا، مرزا غلام احمد قادیانی کی بعض تحریروں کا فارسی ترجمہ کیا۔ ۱۹۷۴ء

میں جب قومی اسمبلی پاکستان نے دستور میں ترمیم کرتے ہوئے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا اور پھر امتناع قادیانیت آرڈی نینس جاری ہوا جس کے تحت احمدیوں کو اسلامی شعائر کے استعمال سے روک دیا گیا تو احمدی رہنما مرزا طاہر احمد نے لندن میں جلاوطنی اختیار کر لی اور اپنے معتقدات کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔ ۱۹۸۸ء کے بعد احمدی لٹریچر کے بہت سے فارسی تراجم شائع ہوئے ہیں۔ (۱۲)

O

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو ادب کے سرمائے میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کی کاوشوں سے بہت وقیع اضافہ ہوا، اور اردو کو ایک علمی زبان بنانے میں ان کی تحریروں کا بنیادی حصہ ہے۔ ان اہلِ علم کی دلچسپیاں بیک وقت اُردو اور فارسی زبانوں سے تھیں۔ محمد حسین آزاد کے آباء واجداد کا تو تعلق ہی ایران سے تھا اور فارسی اُن کے گھر میں بولی جاتی تھی۔ دوسرے دو بزرگ بھی فارسی زبان کی تعلیم و تعلم سے وابستہ رہے تھے، فارسی متون کے پارکھ تھے، فارسی میں شعر کہتے تھے، اور فارسی زبان کے ادیبوں اور شاعروں پر کلام کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے فارسی زبان کی تدریس کے لیے نصابی کتب مرتب کیں، فارسی کے قواعد پر قلم اٹھایا، اردو فارسی کا ایک لغت مرتب کیا، مزید براں فارسی زبان و ادب سے بہتر واقفیت کے لیے ایران کا سفر کیا۔ فارسی اور سنسکرت کے درمیان رشتے تلاش کیے اور لسانیات کے حوالے سے ''سخن دانِ فارس'' تالیف کی، اور اپنے سفر ایران کی یادیں بیان کیں۔ مولانا حالی نے ''حیاتِ سعدی'' تصنیف کی اور حکیم ناصر خسرو کے سفر نامے کو متعارف کرایا، علامہ شبلی نعمانی نے فارسی شاعری کی تاریخ ''شعر العجم'' کے نام سے نہایت منفرد انداز میں لکھی اور اس پر نقد بھی ایک ہندوستانی نژاد حافظ محمود شیرانی نے لکھا۔

حالی و شبلی کی اگلی نسل نے بھی اپنے ذوق اور ضرورت کے تحت فارسی ادبیات کے حوالے سے تصنیف و تالیف سے دلچسپی لی۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے ''خیام'' کی حیات اور آثار پر وقیع کام کیا۔ شمس العلماء محمد عبدالغنی نے ''ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب (انگریزی)'' کے عنوان سے قلم اٹھایا۔ حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے فردوسی اور اس کے شاہنامے کو اپنی توجہ کا موضوع بنایا۔ اس طرح ان حضرات کے شاگردوں نے قدیم فارسی متون کی ترتیب و تدوین اور برعظیم کے فارسی سرمایۂ ادب کے تعارف و تجلیل کے لیے کام کیا۔

فارسی زبان و ادب سے اہلِ برعظیم کی دلچسپی سے جنم لینے والی تالیفات کے ساتھ اولین دلچسپی افغانستان کے اہلِ علم نے لی۔ اس کا سبب افغانستان سے جغرافیائی قربت سے زیادہ افغان طلبہ کی برعظیم میں آمد و رفت تھی۔ متعدد افغان علماء دیوبند اور رام پور وغیرہ، بلکہ برعظیم کے چھوٹے چھوٹے دیہات کے مدرسوں کے تعلیم یافتہ تھے، اور برعظیم کے مسلمان زیرِ تعلیم افغان ملاؤں کی رہائش اور سہولت کا خیال رکھتے تھے۔ افغانستان کے معاملات میں برعظیم کے اصحابِ دانش کی دلچسپی، نیز بیسویں صدی کے نصف اول میں صلاح الدین سلجوقی اور سرور خان گویا اعتمادی جیسے افغان سفارت کاروں کے ہندوستانی اہلِ علم سے روابط نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ برعظیم کی اردو تالیفات کو فارسی میں منتقل کیا جائے۔ جون ۱۹۲۷ء کے شمارہ

''معارف'' میں سیّد سلیمان ندوی نے لکھا تھا:

> یہ خبر بھی مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ہندوستان کی اردو زبان بھی اسلامی ممالک میں اپنا اثر اور رسوخ پیدا کرتی جارہی ہے۔ افغانستان کے محکمۂ تراجم نے اردو زبان سے مولانا شبلی نعمانی کی المامون اور شعرالعجم کا، مولانا نذیر احمد کی بنات النعش، مولوی سید علی بلگرامی کی تمدن عرب، مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کی فلسفۂ جذبات کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ (۱۳)

سیّد سلیمان ندوی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کارپرداز افغانستان اور ایران کے علمی اداروں سے رابطہ رکھتے تھے، اور فارسی زبان وادب پر لکھتے ہوئے جدید تر تحقیقات سے استفادہ کرتے تھے۔ سیّد صاحب نے اپنی تالیف ''خیام'' (اولین اشاعت: اکتوبر ۱۹۳۳ء) کے بارے میں ''معارف'' کے شذرات میں یہ اطلاع دی ہے:

> خاکسار کی کتاب خیام کی قدر یورپ کے مستشرقین اور ایران کے ادیبوں دونوں نے کی اور فرمایش کی گئی ہے کہ اس کا فارسی میں ترجمہ شائع کیا جائے۔ تصحیح واضافہ کے بعد اب یہ نسخہ کابل بھیجا جارہا ہے۔ امید ہے کہ جلد اس کا ترجمہ بلخ اور شاہ پور تک پہنچ جائے گا، جن کو صاحبِ سوانح اپنے قافلۂ عمر کی گزرگاہ سمجھتا تھا۔ (۱۴)

افغانستان کے بعد ایران کے اہلِ علم نے بھی اس جانب توجہ دی۔ سیّد سلیمان ندوی ہی کی اطلاع ہے کہ:

> خوشی کی بات ہے کہ ایران میں بھی ہماری بعض مستند ہندوستانی کتابوں کے ترجمے شروع ہو گئے ہیں، اس سلسلہ میں مولانا حالی کی حیات سعدی اور مولانا شبلی کی شعرالعجم کے فارسی تراجم چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اور شاید شمس العلماء آزاد کی سخندان پارس (کذا: فارس) کا بھی۔ امید ہے کہ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان وہ علمی تعلق پھر پیدا ہوجائے گا جو سوڈیڑھ سو برس سے منقطع ہوگیا ہے۔ (۱۵)

حالی، شبلی اور آزاد کی کتابوں میں سے غالباً مسدس حالی پہلی کتاب ہے جسے ایک کشمیری شاعر فیروزالدین احمد فائضی نے مسدس کی شکل میں فارسی میں منتقل کیا اور ''مسدس فائضی'' کے نام سے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا تھا، (۱۶) اس کے بہت مدت بعد نجف علی خان عاصیؔ جلال پوری نے اپنے قیامِ افغانستان کے دوران میں اس کا دوسرا ترجمہ کیا۔

شبلی نعمانی کی ''شعرالعجم'' سے فارسی بولنے والوں کو زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ افغانستان اور ایران سے الگ الگ اس کے فارسی ترجمے شائع ہوئے۔ وزارت معارف کابل کے لیے اس کی جلد اول، دوم اور پنجم کا ترجمہ منصور انصاری نے کیا، جب کہ جلد سوم کا ترجمہ گویا اعتمادی اور جلد چہارم کا ترجمہ برہان الدین کشکلی نے کیا۔ ایران سے شائع ہونے والا پانچوں جلدوں کا کامل ترجمہ سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کے قلم سے ہے۔

''الفاروق'' سے دلچسپی افغانستان میں لی گئی۔ اس کے ترجمے کا آغاز شاہِ افغانستان نادر شاہ کی بہن نے کیا تھا، مگر ترجمے کے دوران ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جتنا ترجمہ کیا جاچکا تھا، اس کی نوک پلک درست کرتے ہوئے باقی ماندہ حصے کا نجف علی خان عاصی نے ترجمہ کیا اور دو جلدوں میں شائع ہوا۔ حصہ اول (الفاروق) کا ترجمہ دارالتالیف وزارت معارف

کابل کے لیے محمد بن زمان نامی شخص نے بھی کیا تھا۔

افغانستان میں علامہ شبلی کے تراجم کا زیادہ کام سرکاری سطح پر کیا گیا، مگر ذاتی دلچسپی سے ترجمہ کرنے والے سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے شبلی کی جن دوسری کتابوں کو فارسی میں منتقل کیا اور جو کتابی شکل میں دستیاب ہیں، ان میں ''سوانح مولوی'' (ترجمہ سوانح مولانا روم)، ''علم الکلام''، ''الکلام''، ''مقالاتِ شبلی'' اور ''کتاب خانہ اسکندریہ'' شامل ہیں۔ ''الغزالی'' کے منتخب حصوں کا ترجمہ ماہنامہ ''آموزش و پرورش'' (تہران) میں شائع ہوا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی ''سخندانِ فارس'' کو افغانستان کے ملک الشعراء عبداللہ خان (م ۱۳۶۲ھ) نے فارسی میں منتقل کیا جو انجمن ادبی کابل کی جانب سے شائع ہوئی۔ کچھ عرصہ پہلے مولانا آزاد کے سفرِ ایران کی یادداشتیں، جو مولانا آزاد نے بطور تقریر پیش کی تھیں اور اُن کی زندگی میں بطور مضمون شائع ہوگئی تھیں، انہیں جناب عارف نوشاہی نے فارسی میں منتقل کیا اور ایران میں طبع ہوئی ہیں۔

کابل سے مولانا محمود حسن کے ترجمۂ قرآن اور اس پر شبیر احمد عثمانی کے حواشی (جو برعظیم میں تفسیر عثمانی کے نام سے معروف ہیں) کا ترجمہ بھی سن ۱۹۴۰ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا، مگر اس ''قرآن مجید با ترجمہ و تفسیر'' پر مترجمین کے نام نہیں دیے گئے۔

O

قیامِ پاکستان کے بعد سرکاری سطح پر علامہ اقبال کے شعر و ادب کو مقامی اور غیر ملکی زبانوں میں منتقل کرنے کی جانب توجہ دی گئی۔ آغاز کار تو اقبال اکادمی پاکستان، کراچی (حال لاہور) نے کیا تھا، تاہم اس مہم میں دوسرے اہلِ علم بھی شامل ہو گئے۔ آج علامہ اقبال کے اُردو مجموعہ ہائے کلام میں سے ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز (حصہ اُردو) کے کامل فارسی ترجمے دستیاب ہیں۔ مزید براں اُن کی منتخب منظومات (شکوہ و جواب شکوہ، ساقی نامہ) اور متفرق چیدہ چیدہ اشعار بھی مختلف شعراء نے فارسی میں نظم کیے ہیں۔ اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام ہی معروف ماہر اقبالیات مرزا محمد منور کی تالیفات (میزانِ اقبال، ایقانِ اقبال، علامہ اقبال کی فارسی غزل وغیرہ) کو دکتر شہین دخت مقدم صفیاری نے فارسی میں منتقل کیا۔ جاوید اقبال کی ''زندہ رود'' کو بھی فارسی میں اسی خاتون نے منتقل کیا ہے۔

علامہ اقبال کی ایک نادر تحریر کو ''مطالعۂ بیدل در پرتو اندیشہ ہای برگسون'' کے عنوان سے علی بیات تہرانی نے ترجمہ کیا ہے۔ علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ والادت کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی نے ایک تعارفی تحریر لکھی تھی جس کا فارسی ترجمہ سیّد مرتضٰی موسوی نے کیا اور بڑے اہتمام سے مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان - اسلام آباد کے تعاون سے شائع کیا گیا تھا۔ (نومبر ۱۹۷۷ء) اسی طرح اسلامی جمہوری ایران کے رہبر آیۃ اللہ سیّد علی خامنہ ای کی ایک تقریر کا ترجمہ سید محمد اکرم نے ''اقبال: مشرق کا بلند ستارہ'' کے عنوان سے کیا ہے۔

برعظیم کے مسلم فکر و دانش کے ترجمے اور تعارف کے اعتبار سے تین ایرانی دانش ور بہت نمایاں ہیں۔ شبلی نعمانی کے

حوالے سے سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ سیّد گیلانی نے اُردو سے فارسی میں جو مزید ترجمے کیے، ان میں سرسید احمد خان کی تفسیر کے منتخب اجزاء اور تحریر فی اصول التفسیر اور موسیو لیبان کی تمدنِ عرب (ترجمہ: سید علی بلگرامی) بھی شامل ہیں۔ دوسرے ایرانی دانش ور سیّد غلام رضا سعیدی تھے، جنہوں نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی ''حکمت اقبال'' کا ''اندیشہ ہای اسلامی اقبال دانش مند پاکستانی'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی تالیف ''عہد نبوی کے میدانِ جنگ'' کو ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در میدانِ جنگ'' کے نام سے ترجمہ کیا، مزید برآں سید مودودی کے رسائل (''اسلام اور جاہلیت'' اور ''اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر'' وغیرہ) کو فارسی میں منتقل کیا۔ اس سلسلے میں تیسرے ترجمہ نگار سید عبدالہادی خسروشاہی ہیں جنہوں نے سیّد مودودی کے بعض رسائل کے ترجمے کیے ہیں۔

۱۹۷۸ء میں افغانستان پر سوویت حملے کے نتیجے میں لاکھوں افغان مہاجرین پاکستان آئے۔ یہاں رہائش اختیار کرنے اور برسوں کے قیام کے بعد انہوں نے اُردو زبان پر عبور حاصل کر لیا۔ (اور وہ افغان جو حصولِ علم یا تجارت کی غرض سے پاکستان آتے رہتے تھے وہ تو پہلے سے اُردو زبان سے پوری طرح واقف تھے) ان افغان مہاجرین میں سے قلم و قرطاس سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم مختلف علمی اور تعلیمی اداروں سے منسلک ہو گئے، چنانچہ متعدد اُردو کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے، اور غالباً ان افغان مترجمین سے سب سے زیادہ استفادہ دارالعروبہ للدعوۃ الاسلامیہ - لاہور نے کیا جس نے سیّد مودودی کی کم و بیش تمام اہم کتابوں کے تراجم کرائے اور شائع کیے۔ دارالعروبہ کے ساتھ ساتھ دوسرے دینی اداروں نے بھی اپنی اکا دکا تصانیف کو فارسی میں منتقل کیا ہے اور یوں ۱۹۸۰ء کے بعد اُردو تالیفات کے فارسی تراجم میں معتد بہ اضافہ ہوا۔

ایران کے علمی حلقوں نے اس عرصے میں فارسی ادب کی تاریخ پر اردو کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ یہ ترجمے بالعموم برعظیم کے اہلِ قلم نے ہی کیے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکا دکا نے ایرانی شہریت حاصل کر لی ہے۔ سیّد عبداللہ کی تالیف ''ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کے بعد مزید تحقیقات سامنے آئی ہیں، تاہم اس کلاسیک کو جامعہ دہلی کے شعبۂ فارسی کے صدر محمد اسلم خان (م ۲۰۰۰ء) نے فارسی میں منتقل کیا اور بنیاد موقوفات دُکتر محمود افشار۔ تہران کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہوئی۔ اسی طرح ڈاکٹر ظہورالدین احمد نے مغل دور سے حال تک اُن علاقوں کے فارسی ادب کی چھے جلدوں میں تاریخ لکھی ہے جو آج پاکستان میں شامل ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی جلد کا ترجمہ جناب شاہد چوہدری نے کیا جو ''تاریخِ ادب فارسی در پاکستان'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

بنگال کی عربی، فارسی اور اُردو کتابوں کی ایک فہرست تیار کرنے کی داغ بیل ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن نے بیسویں صدی کے آغاز میں ڈالی تھی۔ اور انہوں نے اپنی فہرست کا نام ''ثلاثۂ غسالہ''(۱۷) تجویز کیا تھا۔ اس تالیف کے بارے میں رسائل و جرائد میں اطلاعات ہی شائع ہوئیں، مگر حکیم صاحب اپنی تالیف کو آخری شکل نہ دے سکے۔ اُن کے کاغذات ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری منتقل کر دیئے گئے۔ ان میں ''ثلاثۂ غسالہ'' کا مسودہ بھی تھا، جس سے بنگال میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے استفادہ کیا، مگر یہ مسودہ وقت کے ساتھ منتشر ہوتا چلا گیا، حتّٰی کہ اس بچے کھچے مسودے کو بنگال کی

فارسی شناس خاتون کلثوم ابوالبشر نے متعارف کرایا، انہی سے مسودہ جناب عارف نوشاہی کو حاصل ہوا، جنہوں نے ترتیب و تدوین اور حواشی کے اضافوں کے ساتھ پہلے اس کا فارسی ترجمہ کیا (جو شائع ہوا) اور پھر حواشی وتعلیقات کے ساتھ اصل مسودہ بھی مؤلف کی خواہش کے مطابق ''ثلاثہ غسالہ'' کے نام سے شائع کرایا۔(۱۸)

فارسی شاعری کی تاریخ کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کی ''تنقید شعر العجم'' اور فردوسی پر اُن کے مقالات بھی ترجمہ ہو گئے ہیں۔علمائے کرام کے تذکرے براہ راست ادب کا حصہ تو نہیں، تاہم علماء میں سے بہت سے اچھے ادیب اور شاعر بھی ہوئے ہیں۔ برعظیم میں مرتب کیے گئے شیعہ علماء کے دو تذکرے بھی فارسی میں منتقل ہوئے ہیں۔ان میں سے پہلا تذکرہ مولانا سیّد مرتضٰی حسین فاضل کا ''مطلع انوار'' ہے اور دوسرا سیّد حسین عارف نقوی کی کاوش ''تذکرہ علمائے امامیہ پاکستان'' ہے۔دونوں کو ایک ہی شخص جناب محمد ہاشم نے فارسی میں منتقل کیا ہے اور دونوں کو قم سے ایک ہی ناشر نے شائع کیا ہے۔

O

زیرِنظر تحریر کا مقصد اُردو سے فارسی میں ہونے والے ایک ایک ترجمے کا احاطہ کرنا نہیں ہے۔ یہ کام فہرست نگاری کے تحت انجام پائے گا، تاہم ابھی ایران میں اُردو شناس اہلِ علم کی تعداد اتنی زیادہ نہیں کہ وہ برعظیم کے مسلم فکر کو فارسی میں منتقل کریں، ابھی تک جو کچھ ہوا ہے اس میں ایران نژاد چند افراد شامل ہیں، باقی خدمات برعظیم کے اہلِ علم ہی انجام دے رہے ہیں، تاہم اردو سے ہونے والے فارسی تراجم کی فہرست تیار کرنا بھی ضروری ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۵۳ء

۲۔ مطبوعہ، پیراں پٹن: مطبع نعمانی، ۱۲۲۷ھ

۳۔ محی الدین قادری زور، تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد، جلد دوم، صفحات ۱۴۴۔۱۴۳

۴۔ شاہ تراب کی ایک عشقیہ مثنوی کے تعارف میں سخاوت مرزا نے یہ اطلاع دی ہے۔اردو ادب (علی گڑھ)، شمارہ ۲، ۱۹۶۱ء

۵،۶۔ محمد یوسف کوکن، Arabic and Persian in Carnatic: 1710-1960، مدراس: مؤلف، ۱۹۷۴، صفحات ۱۹۔۳۰

۷۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، گلزار نسیم، لاہور: اردو مرکز، س ن، ص ۱۴